اقبال — احسان دانش کی نظر میں

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

محمد حنیف شاهد

"نام (احسان) تو مزدوروں والا نہیں۔ اچھا خدا اسم با مسمّٰی کرے!"

(اقبال)

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

"نام تو مزدوروں والا نہیں۔ اچھا، خدا اسم با مسمّیٰ کرے!"[۱]

یہ ہیں وہ الفاظ جو علامہ اقبال نے احسان دانش کے بارے میں، ایک ملاقات کے دوران، بطور پیشین گوئی فرمائے۔ ان الفاظ کی صداقت اور سچائی سے کون انکار کر سکتا ہے! احسان واقعی اسم با مسمّیٰ ہے۔ علامہ اقبال کی یہ پیشین گوئی بالکل درست ثابت ہو چکی ہے۔ احسان کے نام سے کون واقف نہیں! اس کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ احسان کو علامہ اقبال سے بہت عقیدت تھی اور اس کی خواہش بلکہ آرزو تھی کہ کسی طرح علامہ اقبال سے ملاقات ہو۔ اس ضمن میں احسان نے مولانا تاجور نجیب آبادی سے کئی بار درخواست کی لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ بالآخر احسان کے مسلسل اصرار پر مولانا تاجور راضی ہو گئے کہ علامہ اقبال سے ملاقات کرا دیں گے۔ اس ملاقات کے بارے میں احسان اپنی تصنیف "جہانِ دانش" میں رقمطراز ہیں:

"مولانا تاجور، علامہ اقبال کے مداحوں میں سے تھے اور کہا کرتے تھے کہ پنجاب کی سرزمین نے یہ بہت تناور انسان پیدا کیا ہے، لیکن یہاں کی پبلک کے دماغ ابھی اونگھ رہے ہیں۔ یہاں اس یگانۂ روزگار کے لیے بھوپال کے تین سو روپے ماہانہ کے وظیفے کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اقبال کی زندگی کے لیے یہ بہت ہے۔ یہاں قوم اور اس کے نشوونما کا تصور سرے سے مفقود ہے۔

"ایک دن میں نے عرض کی مولانا زندگی میں جس قدر اقبال کی شہرت ہے، یہاں اور کس کو یہ رتبہ ملا ہے! مولانا تنک مزاج تو تھے ہی، بگڑ گئے۔ جیسے ان کی خاموشی کے پھوڑے کو چھیڑ دیا ہو۔ بولے: اے اُلّو، تجھے کیا خبر کہ علامہ اقبال کس مقام کے انسان ہیں! یہاں ایسی شخصیتوں کے جوہر تو مرنے کے بعد کھلا کرتے ہیں، کیونکہ مُردہ قومیں مُردوں کو پوجتی ہیں اور زندہ قومیں زندہ لوگوں کے جوہر کو سراہتی ہیں۔

"میں نے مولانا سے کئی بار کہا مولانا! مجھے علامہ اقبال کو دکھا تو دیں، آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔ مولانا نے کہا ہرگز نہیں، میں تجھے اپنے ساتھ ہرگز نہیں لے جا سکتا۔ کسی اور کے ساتھ بھیج دوں گا، دیکھ آنا۔

میں نے کہا مولانا! میں تو آپ ہی کے ساتھ جاؤں گا، آپ سے زیادہ یہاں میرا ہمدرد کون ہو سکتا ہے!

مولانا بولے تو بڑا بے ادب اور منہ پھٹ آدمی ہے۔ تجھے ساتھ لے جا کر میں کیا اپنی توہین کراؤں۔"

میں نے نہایت لجاجت سے کہا مولانا! میں وعدہ کرتا ہوں جب تک وہاں سے واپس آئیں گے، اس وقت تک میں ہونٹ سیے رہوں گا۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالوں گا! مولانا سن کر خاموش ہو گئے۔

"ایک دن مولانا نے مجھے گھر سے بلوایا اور کہا ذرا کپڑے ڈھنگ کے پہن آ! میں نے پوچھا کیا گورنر صاحب کے یہاں جانا ہے؟

مولانا: ابے جاہل! علامہ اقبال کے یہاں جانا ہے، علامہ اقبال کے! جس کے لیے تو روز میرے سر رہتا ہے۔

میں: مولانا! انہیں میرے کپڑوں سے کیا غرض، وہ تو آپ کو دیکھیں گے۔ آپ اپنے مقام کا لباس پہن لیں، میں تو آپ کے خادم کی حیثیت سے جاؤں گا۔ اور میرے پاس کپڑے ہیں بھی کہاں! دو جوڑے ابھی دھو کے سوکھنے کے لیے ڈال آیا ہوں، وہ بھی کئی جگہ سے گونتھ رکھے ہیں۔

مولانا: اچھا! چل یونہی چل لیکن جب تک وہاں رہے، زبان سی لینا، زبان!

میں: جیسا حکم ہو، میری کیا مجال ہے کہ سرتابی کروں!

اس کے باوجود مولانا تمام راستے مجھے تلقین کرتے گئے کہ وہاں زبان کھولنا گستاخی ہے، گستاخی!

"جب مولانا، علامہ اقبال کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچے تو مولانا نے پھر مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور میں تیوری پر بل ڈال کر خاموش ہو گیا۔

مولانا نے جھلا کے کہا: کچھ منہ سے تو پھوٹ، سن رہا ہے کہ نہیں؟

میں: آپ ہی نے تو کہا ہے کہ خاموش رہنا۔ میں تو بڑی دیر سے خاموشی پر عمل پیرا ہوں۔

مولانا مسکراتے ہوئے، علامہ اقبال کے یہاں ایک نیم روشن کمرے میں پہنچ گئے۔ مولانا تاجور اور علامہ تو باتیں کرتے رہے اور میں ان دونوں بزرگوں کو ایک پجاری کی طرح دیکھتا رہا۔

جب چلنے لگے تو علامہ نے مولانا سے میرے متعلق دریافت کیا۔ مولانا نے فرمایا غریب، مزدور آدمی ہے، نہ جانے شعر و شاعری کا روگ کہاں سے لگا لیا اور میرے یہاں آنے جانے لگا۔ عرصہ سے آپ کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ علامہ نے میرا نام دریافت کیا۔ میں نے شرماتے ہوئے لہجے میں کہا احسان! علامہ نے فرمایا: "نام تو مزدوروں والا نہیں۔ اچھا، خدا اسم بامسمّیٰ کرے"!

مولانا جب سڑک پر آئے تو کہنے لگے احسان: تو نے بڑے آدمی کو دیکھ لیا ہے؟ میں نے عرض کی حضور! میں بلاشبہ آپ کا ممنون ہوں۔

مولانا: میں نے تجھے اسی لیے خاموش رہنے کو کہا تھا کہ تو بات نہ کرنا جانتا ہے نہ سننا، بھلا مجھے تیری ممنونیت سے کیا فائدہ"؟

میں نے کہا مولانا! شکریہ کوئی جرم تو نہیں۔

مولانا نے کہا چپکا چپکا چل، بات نہ بڑھا۔ میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ تو خوش نصیب ہے کہ علامہ اقبال سے مل بھی لیا اور دعا بھی لے لی ہے۔

مندرجہ بالا واقعے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ احسان کی علامہ اقبال سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی البتہ احسان کی ایک نظم اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ لکھتے ہیں:

برسات کی اک شام سے زرکار تھا عالم
تھیٹر کے قریں خلد بریں کا تھا نظارا

اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ احسان برسات کی ایک شام کو علامہ اقبال کے دولت کدے واقع میکلوڈ روڈ پر بغرض ملاقات تشریف لے گئے تھے جو تھیٹر یعنی سینما کے قریب تھا۔ علامہ اقبال اس کوٹھی میں ۱۹۲۲ء کے اواخر سے لے کر مئی ۱۹۳۵ء تک رہائش پذیر رہے چنانچہ احسان نے ۱۹۲۲ء اور ۱۹۳۵ء کے دوران علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ اس ملاقات سے احسان نے علامہ اقبال سے جو تاثر لیا اور ان کی خستہ حال کوٹھی کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا۔ اسے "ڈاکٹر اقبال کی کوٹھی" کے عنوان سے نظم کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اس نظم کے ذریعے نہ صرف احسان اور علامہ اقبال کے درمیان ملاقات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ علامہ اقبال کے بارے میں احسان کے تاثرات اور محسوسات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یہ نظم چونکہ نایاب ہے، لہٰذا ہدیۂ قارئین ہے ؎

بھیگے ہوئے پیڑوں کی پھننگیں تھیں گلابی
لیکن کوئی چمکا نہ تھا گردوں پہ ستارا
اک سمت جو اٹھتی مری مخمور نگاہیں
چمکا مرے دل میں غمِ پنہاں کا شرارا

کوٹھی کی منڈیروں پہ اُداسی نظر آئی
اللہ رے غمناک و غم انگیز نظارا!

سنسان سی دہلیز تھی، چپ چاپ سے کمرے
جیسے کبھی اوّل سے سجایا نہ سنوارا

دالان کے زخموں میں تھا برسات کا پانی
اینٹوں کا، پلستر کے شگافوں سے نظارا

یہ دیکھ کے اک درد سا اُٹھا مرے دل میں
اشکوں کو نہ آنکھوں میں رہا ضبط کا یارا

تھی سامنے بیدردیِ احباب کی تصویر
اشکوں سے ہوا تر مرے دامن کا کنارا

حیراں تھا کہ ہوتا ہے ضیا بار یہاں سے
تہذیب کے گردوں کا درخشندہ ستارا

ہے جس کی نظر شعلۂ مستور کی شاہد
ہر موجِ نفس جلوۂ سینا کا شرارا

حل کرتا ہے راتوں کو ستاروں کے معمے
ہے عرشِ بریں جس کے تخیل کا کنارا

ہر مصرعِ موزوں میں ہیرالڈ سے طلائی
ہر شعر ہے اک کوثر و تسنیم کا دھارا

ہر لفظ ہے مستقبلِ زرّیں کا پیامی
ہر بات میں بیداریِ مسلم کا اشارا

اللہ کی قدرت کا تماشا تھا نظر میں
اقبال کا، اور ایسے مکاں میں ہو گزارا!

سنتا ہوں کہ اب ہو گئی کوٹھی کی مرمت
احسانؔ کبھی دیکھنے جاؤں گا دوبارا؟

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

احسانؔ کا علامہ اقبالؔ کی کوٹھی کا یہ مرثیہ نہ صرف ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تاریخی اہمیت کا بھی حامل ہے کیونکہ علامہ اقبال کی شخصیت اور فن کے بارے میں تو سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کی رہائش گاہوں کے متعلق زیادہ معلومات دستیاب نہیں، صرف ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور مولانا عبدالمجید سالک نے مذکورہ کوٹھی کے بارے میں مختصراً ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

"علامہ کے قیام کے دوران میں اس کوٹھی کی مرمت ہوتے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اکثر دیواروں سے پلستر غائب تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، سخت گرمی کا زمانہ تھا، پروفیسر ڈکن سن جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ان دنوں تازہ تازہ علی گڑھ سے آئے تھے، علامہ کے ہاں آئے۔ اتفاق سے کوٹھی کے درمیانی کمرے میں نشست تھی۔ کمرے میں نہایت بے ترتیبی سے دیوار پر ملکہ وکٹوریہ کی رنگین تصویر بغیر شیشے کے آویزاں تھی۔ پروفیسر ڈکن سن کی نظر جب تصویر پر پڑی تو مسکرا کر علامہ سے پوچھا کہ آپ کو تصاویر سے بھی ذوق ہے۔ علامہ نے مسکرا کر تصویر کو اپنے ہاتھ سے ذرا حرکت دی تو پیچھے سے

دیوار میں ایک شگاف نمودار ہوا جسے تصویر نے ڈھانپ رکھا تھا، اور یہی اس کا مصرف تھا۔"[۵]

دیگر متعدد شعراء کی طرح احسان بھی علامہ اقبال سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انہیں نہ صرف علامہ اقبال سے عقیدت تھی بلکہ وہ اپنے آپ کو علامہ کا پجاری کہتے تھے۔ یہ تاثر ان کی ذات تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس کا اظہار ان کے کلام سے بخوبی ہوتا ہے۔ میرے خیال میں کسی دوسرے شاعر نے علامہ اقبال کو اشعار کی صورت میں اتنا خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا جتنا احسان نے پیش کیا ہے۔ احسان کی ایسی ان گنت نظمیں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا ہے کہ احسان علامہ اقبال سے بہت زیادہ متاثر تھے اور انہوں نے انہی کے رنگ و آہنگ کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ وہ کس حد تک کامیاب ہوئے، اس کے لیے ان کی کتاب "مقامات" کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید "احسان دانش، قطعے کے آئینے میں" میں لکھتے ہیں:

"احسان دانش برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے تو علامہ اقبال کا سانحۂ ارتحال ہو چکا تھا۔ اور ان کے فکر و فن کی گرفت پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ اور ان کی تب و تاب شعراء کو مسلسل متاثر کر رہی تھی۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک اقبال کا پُرشکوہ آہنگ پیدا کرنا شعراء کی خصوصیت شمار ہوتا تھا۔ احسان دانش نے "جہانِ دانش" میں جگہ بہ جگہ اور "مقامات" کے انتساب میں اقبال کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ان سے شدت سے متاثر تھے اور انہوں نے اقبال کے فعال انداز کو اپنانے کی کوشش کی۔ ان کی کتاب "مقامات" کے بیشتر قطعات اس وجاہت کا مظہر ہیں۔"[۶]

ڈاکٹر انور سدید مزید لکھتے ہیں۔

"ان کی ادبی انفرادیت اس بات میں ہے کہ انہوں نے اپنے پیش رو شعراء اقبال اور جوش وغیرہ کو قابلِ تقلید تصور کرتے ہوئے بھی ان کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اپنے محسوسات کو ذات کی تخلیقی کٹھالی سے کندن بن کر نکلنے کا موقع عطا کیا۔ یہ جوہر قطعہ نگاری میں بھی کھل کر سامنے آتا ہے، مثلاً ؎

چاند سے کچھ دور اک تارا چمکتا ہے مدام — دونوں اپنے اپنے مرکز سے مگر ہلتے نہیں
جس طرح دو طالب و مطلوب ناراضی کے بعد — تنہا تنہا راہ میں چلتے ہیں اور ملتے نہیں[۷]

لیکن آغا شورش کاشمیری کہتے ہیں۔

"احسان ۔ اقبال، جوش اور حسرت کا حد اوسط ہیں۔ ان کے ہاں اقبال کی فکر نہیں، جذبہ ہے۔ جوش کے الفاظ نہیں، کیونکہ احسان کے الفاظ عوام سے زیادہ قریب ہیں، اور عوام سے مخلص بھی زیادہ ہیں۔ مگر جوش کا ولولہ ان کے ہاں ضرور ہے۔ حسرت نے غزل کو جو گداز دیا، وہ ان کے ہاں بھی ہے، مگر احسان نے غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کو ملا کر غزل کا ایک سانچہ تیار کیا ہے جو انہی سے منفرد ہو گیا ہے۔" ۸

توقیر طاہر کا بیان ہے:

"احسان، میر انیس اور نظیر اکبر آبادی کے علاوہ اقبال اور جوش سے متاثر تھے۔" وہ رقم طراز ہیں:

"میر انیس اور نظیر اکبر آبادی کے مطالعہ کے بعد احسان دانش پر ماحول کا جو اثر اصولی طور پر ہونا چاہیے تھا، وہ تو ظاہر ہے، مگر اس دور میں احسان سے پہلے کوئی شاعر بھی اقبال اور جوش کی تقلید تو کجا۔ گردِ راہ کو بھی نہ پہنچ سکا تھا، لیکن اس کے ذاتی جوہر اور فطری صلاحیتیں ایسی کارفرما ہوئیں کہ یہ ہندوستان بھر میں، اپنے ہم عصر شعراء سے کٹ کر، زمانہ کی تیز رفتار و مشکلات پر مسکراتا ہوا، اپنے پیش روؤں کی صف میں جا ملا، اور اس مردانہ روی سے، کہ پرواز کی کوئی گرفت اس کے دامن اور کوئی حادثات کی دیوار اس کے تلوؤں کو آلودہ نہ کر سکی۔

"احسان دانش کے کلام میں جہاں نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کی رُوحیں بولتی نظر آتی ہیں، وہیں علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کے اسلوب بھی پرتو فشاں ہیں جو وقتی اور عمری تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے اصولی طور پر ضروری ہیں۔" ۹

پروفیسر سجاد حارث، احسان اور اقبال کے فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ خودی پر تبصرہ کرتے ہوئے، اپنی تصنیف "عوامی شاعر اور اس کا فن" میں تحریر کرتے ہیں:

"راشد، میراجی، منٹو، عصمت، عسکری، فیض، ساحر، جذبی، جوش، اور اقبال وغیرہ سے کہیں زیادہ احسان کا فن اس سخت و سنگلاخ زمین سے لگ کر زندگی کی تلخ ترین حقیقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ارتقا کی سیڑھیوں پر چڑھا ہے، مثلاً

؎ رموزِ ہستیِ انساں کو انساں پا نہیں سکتا معمہ یہ کسی صورت سمجھ میں آ نہیں سکتا

آگے چل کر اسی نظم میں ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں۔

؎ قدم راہِ طلب میں جو بھی بڑھ جائے غنیمت ہے حقیقت کو اگرچہ فکرِ انساں پا نہیں سکتا

اور پھر مجبوریِ انسان کے احساس کی پستی اور کم مائگی کا اظہار اسی ذہنی تسلسل کے ساتھ ان الفاظ

پر آکر ختم ہوتا ہے۔

؎ اسیرِ حدِ امکاں ہے بصیرت نوعِ انساں کی پرے سورج سے اُڑ کر کوئی ذرہ جا نہیں سکتا

اس کے برعکس اقبال کی خودی پر اگر ہم غور کریں تو یقیناً ان اشعار کو پڑھ کر احسان کی فکری کم مائگی کا بُری طرح احساس ہوتا ہے۔ اقبال اپنے فکر و نظر کی کمند ستاروں سے آگے پھینکتے ہیں اور زمان و مکان کی قیود کو زیر و زبر کر ڈالتے ہیں۔ وسیع انسانیت کے قدموں میں حیات و کائنات کے سارے اسرار و رموز لا کر ڈال دینے کی سعی کرتے ہیں اور جد و جہد کے لیے بے پناہ جذبات اور امکانات کی نئی راہیں کھولتے ہیں۔ ہمتِ مردانہ کو قدم قدم پر فکر و عمل کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

؎ یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

لیکن احسان، اپنے جمہوری کردار اور ترقی پسند نظریۂ حیات کے باعث، حدِ امکان کی مجہول بصیرت میں زیادہ دنوں تک اسیر نہیں رہ سکے کیونکہ ان کا فکری ارتقاء حرکت پذیر اور تغیر پسند رہا ہے۔ اس خصوصیت کے باعث ایک مقام پر آکر وہ یہ کہتے ہیں۔

؎ نظر سے وقت کے ہر لمحہ پردے اُٹھتے جاتے ہیں مگر مرکز کسی تعمیر کو ٹھہرا نہیں سکتا

اگرچہ ابھی ان کی فکر و بصیرت میں وہ بلند حوصلگی پیدا نہیں ہوئی جو اقبال کے نظریۂ حیات کا طرۂ امتیاز رہا ہے، ابھی وہ سر جھکائے شاہراہِ زندگانی پر گامزن ہیں اور آفتاب و کائنات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے عادی نہیں ہوئے، اور ابھی وہ ادراکِ حقیقت کے راستوں سے دُور ہو کر چلتے ہیں ؎

ہے نادانی کسی شے پر نگاہوں کو جما دینا چلا چل سر جھکا کر شاہراہِ زندگانی سے

ان کا فطری ارتقا منزل بہ منزل بڑھتا جاتا ہے۔ بالآخر وہ شاہراہِ زندگانی کے ایک ایسے سنگِ میل پر آپہنچتے ہیں جہاں وہ رموزِ ہستی کو سمجھنے کی جد و جہد کرنے لگتے ہیں، اور جس حقیقت کو پہلے وہ فکرِ انساں کے اختیار کی چیز نہیں سمجھتے تھے اور جس بصیرتِ نوعِ انساں کو وہ اسیرِ حدِ امکان سمجھتے تھے، اب اس نئی منزل پر پہنچ کر انہیں وہ سب خیالات باطل دکھائی دیتے ہیں اور ادراکِ حقیقت کے لیے حیات آفرین تصورات سے سرشار ہو کر تیقن اور اعتماد کے ساتھ ایک نئی دُنیا کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

؎ ڈھائیں گے عقائد کے گھروندوں کو نئے لوگ اس بزم کا نقشہ ہی نیا ہو کے رہے گا

اس دور کی تحلیلِ عناصر پہ نظر ہے — اس فرض سے یہ عہدہ برآ ہو کے رہے گا
مستقبلِ انساں ہے قیاسات سے باہر — خاکم بدہن یہ تو خدا ہو کے رہے گا
ظلمات سے پھوٹیں گے مرواجم و خورشید — ہر ذرہ تعین سے رہا ہو کے رہے گا [۱۰]

آگے چل کر لکھتے ہیں ؎

جتنی، جس انساں کو، توفیقِ خودی ہوتی گئی — زندگی آگاہِ رازِ زندگی ہوتی گئی

یہ شعر اقبال کے فلسفۂ خودی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ شعر اور اسی طرح کے سیکڑوں اشعار زندگی کے بارے میں صرف ایک مخصوص قسم کے تصور کو ہی پیش نہیں کرتے بلکہ ان پر اقبال کے فکری میلانات کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اقبال کے اثر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ احسان کی اپنی شخصیت اور زندگی چند مستعار خیالات و معتقدات میں یکسر دب کر رہ گئی ہے۔ مجموعی طور پر احسان کی متعدد غزلوں میں اقبال ہی کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔" [۱۱]

پروفیسر سجاد حارث، اقبال اور احسان کے نظامِ فکر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگر پریم چند اور ٹالسٹائی اپنے مذہبی معتقدات اور ذہنی تضادات کے باوجود انسانیت کے عظیم فنکار تسلیم کیے جا سکتے ہیں اور اقبال کو اسلامی نظامِ فکر کا ترجمان سمجھتے ہوئے ترقی پسند ادیبوں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے، تو احسان دانش کو بھی ان کے مذہبی اعتقادات، ذہنی تضادات اور نظری خام کاری کی بنا پر ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ احسان کی شاعری میں بھی پریم چند اور ٹالسٹائی کی طرح ظلم سے نفرت اور انسانیت سے بے پناہ محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ان کی نظموں کے ہر لفظ میں اس سماجی نظام کے خلاف صدیوں کی تلخی اور نفرت بھری ہوئی ہے جس کی بنیاد ظلم، تشدد اور بے انصافی پر قائم ہے۔ احسان دانش نے جدید اردو ادب میں باشعور طریقہ سے محنت کش طبقہ کی ترجمانی کے لیے قدم اٹھایا ہے اور خود کو "شاعرِ مزدور" کہنے میں فخر و عزت کا احساس کیا ہے۔ یہ احسان کی شاعری کے مطالعہ کا سب سے قابلِ قدر پہلو ہے۔

میری فطرت ہے وفا، حرص و ہوا سے دور ہوں — شاعرِ مزدور ہوں، میں شاعرِ مزدور ہوں [۱۲]

جو مشترک اقدار احسان اور اقبال میں پائی جاتی ہیں یا یوں کہیے کہ احسان نے اقبال سے متاثر ہو کر جن باتوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ دونوں "شاعرِ فطرت" ہیں۔ اس سلسلے میں وحید الحسن "احسان دانش۔ شاعرِ فطرت کے روپ میں" کے عنوان سے رقمطراز ہیں۔

پھر سید قطب الدین محمد شیرازی نے میر داماد کے مقابلے میں مولانا (روم) کا رفاع کیا ہے:

اے کہ طعنہ می زنی بر مولوی | اے کہ محرومی ز فہم مثنوی
گر تو فہم مثنوی می داشتی | کے زبانِ طعنہ می افراشتی
گرچہ سستیہائے استدلال عقل | مولوی در مثنوی کردہ است نقل
لیک مقصودش نبودہ عقلِ کُل | زانکہ اُو ہادیست در کُل سُبُل
بلکہ قصدش عقل جزوی فلسفی ست | زانکہ او بے نور روئے یوسفی ست
عقل جزوی چون مشوب از وہماست | زآن سبب مذموم نزد اولیاست

(ترجمہ:۔ تو نے مولوی (رومی) پر طعنہ زنی کی ہے، تُو تو مثنوی کے فہم وادراک ہی سے محروم ہے۔
اگر تو مثنوی رومی کو سمجھنے کے قابل ہوتا تو پھر یہ زبانِ طعن دراز نہ کرتا۔
اگرچہ مولوی نے اپنی مثنوی میں عقل کے استدلال کی کمزوریاں بیان کی ہیں،
لیکن اس سے ان کی مراد "عقلِ کُل" نہ تھی، کیونکہ وہ (عقل کل) تو تمام راستوں میں رہنمائی کرنے والی ہے۔
مولانا نے تو فلسفے کی جزوی عقل کی بات کی تھی کہ وہ کسی یوسف کا بے نور چہرہ ہے۔
جزوی عقل چونکہ اوہام کا نتیجہ ہے اس لیے اولیا کے نزدیک مذموم ہے)
(فلسفۂ عالی یا حکمت صدر المتالہین، جلد اول طہران ۱۳۴۲، صفحہ ۹۰ پر جواد مصلح کے مقدمہ سے ماخوذ)

۴۔ چونکہ امام فخر (رازی) کو بو علی سینا کی کتاب "اشارات" پر تنقید کے برخلاف تمام عقلی علوم سے، منجملہ فلسفۂ مشائی (ارسطو سے منسوب فلسفہ) کے، کامل آشنائی تھی، اس لیے فلسفہ کے بہت سے مخالفین نے انہیں فلسفی کے طور پر جانا اور فلسفہ کے زمرہ میں شمار کرتے ہوئے، تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

۵۔ خاقانی کے درج ذیل مشہور اشعار، اُس کی اس دور کے ادبا کی فلسفہ سے متعلق مروجہ طرز فکر کی پیروی کے غماز ہیں:

۱۔ فلسفہ در سخن میآمیز ید | وآنگہی نام آن جدل منہید
۲۔ دحل گمرہی است بر سر راہ | ای سران پای در دحل منہید

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے — تاروں کے قافلے میں میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے — بے ہوش جو پڑے ہیں، شاید انہیں جگا دے

احسانؔ دانش کہتے ہیں ؎

یہ آرزو ہے کسی کو رازِ حیات کا راز داں بنالوں — کسی سے رودادِ شوق کہہ دوں، کسی کو ہم داستاں بنالوں
جو میرے جبریلِ شاعری کو اصولِ پیغمبری سکھا دے — جو میرے قصرِ یقیں کو صدق و صفا کی شمعوں سے جگمگا دے
میسر آجائے ایسی ہستی تو کیا بتاؤں کہ کیا کروں میں — نہ ہو غلامی کا رنگ جس میں وہ سجدۂ بے ریا کروں میں
خرام گاہوں میں اس کے نقشِ خرام کو کہکشاں بنا دوں — اگرچہ احسانؔ میں ہوں فانی مگر اسے جاوداں بنا دوں

جہاں تک انسان اور فطرت کے باہمی روابط کا تعلق ہے، ورڈز ورتھ، اقبالؔ اور احسانؔ تینوں ایک ہی منزل پر گامزن نظر آتے ہیں۔ لیکن جب انسان اور فطرت میں تصادم ہوتا ہے تو ان تینوں شاعروں کے نقطہ ہائے نظر میں نمایاں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ورڈز ورتھ، فطرت پر انسان کی برتری کا قائل ہے لیکن تسخیرِ فطرت کو اپنا ایمان نہیں بناتا۔ اقبالؔ، انسانیت کے کمال کے لیے تسخیرِ فطرت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے عقیدے میں فطرت کا کام بس اتنا ہے کہ وہ انسان کو حساس کر دے، اس کے بعد فطرت خود انسانیت میں گم ہو کر انسان کی خودی کو بیدار کرے۔ شاعر، فطرت کا نکتہ داں ہے اور جس قدر جلد فطرت کو تسخیر کرلے، اسی قدر جلد اس کی خودی کمال کی منزل پر پہنچ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کے یہاں اس کائنات میں فطرت کی جلوہ گری سے زیادہ انسان کی جلوہ گری کارفرما ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ایں جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است — جلوۂ اُو گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے اُو را — حلقہ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نا دیدنِ من — چہ زمان و چہ مکاں، شوخیِ افکارِ من است

احسانؔ بھی اگرچہ انسان کے لیے فطرت کی بقا ضروری سمجھتے ہیں لیکن وہ فطرت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ انسان کی تخلیقات میں فطرت کو شامل کر لیتے ہیں لیکن جب انسان کا شعور خود آگہی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور وہ دنیا کے بندھنوں سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کا راستہ متعین کر لیتا ہے تو اسے فطرت کی رہنمائی کی ضرورت نہیں، اور ایک وہ بھی مقام آجاتا ہے کہ تکمیلِ انسانیت کے بعد شاعر یا ادیب، فطرت کی رہنمائی کرنے لگتا ہے۔

کیا ہے میں نے نیاز مندی سے اک دلِ بے نیاز پیدا
ضمیرِ فطرت میں میرے سوزِ کلام سے ہے گداز پیدا
بپا کیے ہیں زمینِ شعر و سخن میں وہ انقلاب میں نے
دیے ہیں یعنی بجھے چراغوں کی گود میں آفتاب میں نے

اپنی ذات پر اعتماد اور اپنے جذبہ ہائے پُرخلوص پر یقین ایک آرٹسٹ کو خدا سے نزدیک کر دیتا ہے۔ اگر خدا نے اس کائنات میں تخلیق کا کام سنبھال لیا ہے تو شاعر نے بھی سُنّتِ الٰہی کے تحت آرٹ کی تخلیق کا کام سنبھال لیا ہے۔ اقبالؔ نے اس مقام پر فطرت پر انسان کی برتری اور تخلیقی عمل کا ذکر کرتے ہوئے، خدا سے بھی دو دو باتیں کی ہیں۔ انسان، خدا سے کہتا ہے کہ میری تخلیق تیری تخلیق سے کم تر نہیں ہے

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

احسانؔ بھی ورڈز ورتھ اور اقبالؔ کی طرح فطرت کی ان تمام بوالعجبیوں سے واقف ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ایک نظم "زعمِ شاعر" میں وہ کہتے ہیں

مرے قلم کو ہے تمیزِ شعر پیرائی
عروسِ نظم کے گیسو سنوار دیتا ہوں
شبابِ حُسن کے پنہاں ترین جلووں کو
نگاہِ عشق اثر سے نکھار دیتا ہوں
مرے نقوشِ تخیّل میں زندہ جاوید
بگڑ کے حُسن کی ہستی سنوار دیتا ہوں
شرابِ نغمۂ دل سے فضا کو نہلا کر
چمن چمن کو نویدِ بہار دیتا ہوں
ہے چشمِ حور و ملائک کو آرزو میری
خدا سے ہوتی ہے خلوت میں گفتگو میری

یہی نظر کی بلندی، فطرت پر بالادستی، خداشناسی، انسان دوستی احسانؔ کو ایک عظیم شاعرِ فطرت ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ احسانؔ کو فطرت سے بڑا پیار ہے۔ فطرت نے اس پیار کا انعام احسانؔ کو یہ دیا کہ ان کے کلام میں ادبی اور شاعرانہ مصوری رچ بس گئی، انگریزی شعراء کی طرح ہمارے شعراء کے یہاں بھی تجریدی تصورات کو جاندار اور جیتی جاگتی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اقبالؔ، جوشؔ اور احسانؔ کی نظموں میں یہ شاعرانہ مصوری کمال کو پہنچ گئی ہے۔ خیالات کو تجسیم

کرنا بڑا ہی نازک فن ہے کیونکہ اس سے فن کی قدریں مجروح ہوتی ہیں لیکن باکمال شاعر اس فن سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ احسان نے اس شاعرانہ مصوری کو کئی رُخ دیئے ہیں، کبھی تو وہ جاندار اشیاء کو بے حس و حرکت دکھاتے ہیں اور کبھی بے جان اور جامد اشیاء کو محسوسات کی شکل دے دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر انہوں نے تشبیہ و استعارے سے مکمل طور پر کام لیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ کلام میں زور، شعر میں گرج، نظم میں بانکپن اور منظر میں سحر کاری پیدا ہو گئی ہے۔ اس قسم کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کی نظم "کوہ مری" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بلند و پست سے لپٹی ہوئی حسیں راہیں — یہ سبزہ زار، یہ پاکیزہ تر "ہوا گاہیں"
یہ "ماضیوں کے مقابر" یہ "دور کے کہسار" — یہ "واقعات کے قبّے"، یہ حادثوں کے مزار"
یہ "گھاٹیوں کے قبیلے"، یہ "پتھروں کی ملل" — یہ "رفعتوں کے در و بام"، یہ ظلمتوں کے محل
یہ "بے کلس کلیسا" یہ "برجیوں کی قطار — دبیز تیرگیوں کے جمے ہوئے انبار

آپ نے غور کیا کہ وہ بے جان اشیاء کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا ذی روح ہیں اور تشبیہات میں ان الفاظ کو پسند کیا ہے جن میں حرکت پائی جاتی ہے یا جو جسم رکھتے ہیں، مقابر، قبّے قبیلے، بے کلس کلیسا۔ ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک تمدن کی زندہ تصویر ہیں۔ اسی مقام پر احسان کی شاعرانہ بزرگی اور عظمت کا راز ظاہر ہوتا ہے یہ شاعرانہ مصوری فطرت کی آغوش میں زیادہ پلی ہے۔ فطرت نے ان کے دل و دماغ کو جِلا بخشی۔ احسان کے تجربات فطرت کے رہینِ منت ہیں۔ احسان کی ساری زندگی کد و کاوش اور جد و جہد میں گزری اور دو گھڑی انہیں سکھ نصیب نہ ہوا۔ فطرت کو احسان کے اس المیے کا پورا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت نے احسان کو اُمیدوں کے سہارے، اپنے حسین جلووں کی مدد سے، اپنی پُر فریب نزاکتوں میں بہلا کر ایک اعلیٰ انسان بنا دیا ہے۔

عبدالمالک آروی اپنی تصنیف "اقبال کی شاعری" میں رقمطراز ہیں:

"اقبال کی شاعری نے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کو اثر پذیر کیا۔ لیکن اقبال کا یہ اثر پنجاب اور اودھ پر زیادہ گہرا رہا۔۔۔۔ یوں تو ملک میں کافی تعداد ان شعراء کی ہے جنہوں نے اقبال کی تقلید میں نظمیں کہنی شروع کیں اور ہمارے اردو ادب میں اقبال کے ان مقلدوں کی بدولت بہت سا ذخیرہ جمع ہو گیا لیکن حقیقت میں اقبال کے صحیح جانشینوں میں ہمارے سامنے صرف دو ہی شاعر نظر آتے ہیں: ایک جوش دوسرے احسان۔ سیماب نے بھی اس منصب کی کوشش کی لیکن وہ ہمارے عہد کے مصحفی ہیں۔ اقبال شاعرِ اسلام ہیں۔ احسان

موضوع پر ایسی اثر انگیز نظمیں نہ اقبال نے کہی ہیں نہ جوشؔ نے۔ یہ احسانؔ کی اپنی بیتی ہیں۔ جہاں اقبالؔ اور جوشؔ کا ذہن پہنچ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ تو بلندی و پستی، دونوں جگہ قبولیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن جوش کو امراء زیادہ پسند کرتے ہیں اور احسانؔ کو غربا۔ احسانؔ غریبوں کا شاعر ہے۔ اس کے شعر کا موضوع بسترِ سنجاب کی بجائے بوریا ہے۔

احسانؔ کی نظم "مزدور کی موت" اُردو زبان کے غیر فانی شاہکاروں میں سے ہے۔ یہ نظم احسانؔ کی جیتی جاگتی تصویر ہے صورِ شعریہ یا محاکات کی ایسی مثالِ بدیع شاید ہی اور کہیں نظر آئے۔ احسانؔ اگر اپنی پوری زندگی میں صرف یہی ایک نظم کہہ جاتے، جب بھی ان کی حیات کی ضمانت ہو سکتی تھی، لیکن جشن بیچارگی لکھ کر تو انہوں نے اپنی شاعرانہ انفرادیت بھی منوالی۔

"مزدور کی موت" "مزدور کا چالان" اور "جشنِ بیچارگی" احسانؔ ہی کے قلم سے نکل سکتی تھیں جو "میرا گھر" "غمِ فاطمہ" اور "خندۂ غرور" لکھ سکے۔ اقبالؔ کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا اور جوشؔ بھی اس نوع کا کوئی المناک تصور نہ کر سکتے تھے۔

احسانؔ کے نالہ میں درد اور تیقن، جوشؔ کا اندازِ خطاب بلیغ اور شاعرانہ ہے۔ احسانؔ کا انداز سلیس اور حکیمانہ۔ احسانؔ کو جب مقدر نے وطن سے بہت دور، پنجاب میں پھینکا تو اس کو ایک مدت کے لیے وطن کی زیارت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ اس دوران میں اس کا گھر گر گیا۔ ایک زمانہ کے بعد جب وہ اپنے وطن میں آتا ہے تو اپنے گھر کا نقشہ اس کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ اس نے ایک نظم لکھی جس کے آخری اشعار تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

میں تو اپنی سخت جانی سے یہ صدمہ سہہ گیا — میرے غم میں میرا گھر برباد ہو کر رہ گیا
آج اپنے اس شکستہ گھر میں پھر آیا ہوں میں — بے بسی کے چند آنسو نذر کو لایا ہوں میں

اور آخری شعر میں تو گویا دل نکال کر رکھ دیا ہے ؎

دل بھرا آتا ہے، رو کوں کس طرح، انساں ہوں — آہ! میں اپنے وطن میں ہوں مگر مہماں ہوں

یہ ہُوک اقبالؔ اور جوشؔ کے دل میں کہاں سے آتی!

احسانؔ نے اُردو زبان میں بحیثیت نظم نگار شہرت حاصل کی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ غزل گو کی حیثیت سے ناکام رہا ہے۔۔۔۔۔ اقبالؔ، جوشؔ اور احسانؔ تینوں نے غزلیں کہی ہیں۔ اقبالؔ کی رہبری داغ کے ہاتھ آئی تھی۔ داغؔ، گو ہماری زبان کا ایک ناقابلِ فراموش شاعر تھا لیکن اقبالؔ کا رجحان و مذاق اس سے بالکل مختلف تھا۔ جوشؔ، غزل کے مخالف ہیں۔

وہ غزل گو کی حیثیت سے ناکام ہیں، کم مشق ہیں۔ ان کی غزلوں میں کوئی انفرادی رنگ نہیں۔

احسان، غزل گوئی کے اعتبار سے اقبال اور جوش، دونوں سے زیادہ کامیاب ہے۔ اُس کی غزلیں بہت بلند ہیں۔ وہ قدرت کی طرف سے غزل گو ہی بننے کے لیے آیا تھا لیکن فضا اور ماحول نے اس کو نظم نگار بنا دیا۔ اس کے تغزل کا حقیقی رنگ اس کی ہر نظم میں موجود ہے، اور جب وہ غزل کہنے لگتا ہے تو مشکل سے یقین آتا ہے کہ وہ غزل گو شاعر نہیں بلکہ نظم نگار ہے۔ احسان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آہ! اُس عاشقِ ناشاد کا جینا اے دوست — جس کو مرنا بھی ترے عشق میں مشکل ہو جائے

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو — تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

یہ کس نے دمِ مرگ صورت دکھا دی — میرے دل سے جینے کی حسرت مٹا دی

اقبال طبعاً محتاط تھے، اخلاق و عادات پر اسلامی بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا گہرا اثر تھا۔ احسان نسائیات میں اقبال اور جوش کی درمیانی راہ پر ہیں۔ وہ ابتدا کرتے ہیں جوش سے، لیکن ختم کرتے ہیں اقبال پر۔

بعض نظموں کی ابتدا تو انہوں نے جوش کی نظموں کو سامنے رکھ کر کی ہے، مثلاً دیہاتی دوشیزہ" کے ابتدائی اشعار پڑھیے اور "جنگل کی شہزادی" پر ایک نظر ڈالیے تو آپ کو یہ تتبع صاف نظر آئے گا۔ احسان کی شاعری گو پنجاب میں پروان چڑھی لیکن یہاں کی رومانی فضا کا اثر احسان پر نہیں۔ احسان زندگی کے جن سخت مراحل سے گزرے، وہاں عشق و رومان کی فرصت کہاں! اس کی زندگی تو ان دھڑکوں میں گزری کہ کل کا دن آلام کی کون سی نئی تلخی لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احسان کے پورے سرمایۂ خیال میں ہمیں جوانی کی اُمنگیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ حالانکہ جس سرزمین سے اس کا تعلق ہے، وہاں ریاض و امیر کا رچا ہُوا مذاق پھیلا ہُوا تھا اور اگر ان کو سکون ملتا تو ممکن ہے وہ کچھ مزے کی باتیں بھی کہہ جاتے۔

احسان کے یہاں عورت کا رومانی تصور تو یقیناً فسردہ، اکثر بے آب و رنگ اور مضمحل ہے۔ لیکن عورت کے دوسرے اخلاقی اور جمہوری فضائل پر انہوں نے جو نکتہ سنجیاں کی ہیں، ان کو پڑھتے کے بعد ہم انہیں اقبال سے بہت قریب پاتے ہیں۔ احسان نے "پردہ" اور "غمزدہ" لکھ کر نسائیات پر عقیدت کے جو پھول برسائے ہیں ان کو ہماری سوسائٹی اور ہمارا ادب فراموش نہیں کر سکتا۔ احسان، اقبال کی طرح دل کی گہرائی سے مذہب اور اسلامی معاشرت کا احترام کرتا ہے۔ احسان نے عورت

کے ایثارِ بے پناہ اور عشق و وفا کی جو تمثیل لکھی ہے، اس نظم کا آخری شعر ہے ؎

صنفِ نازک کی وفا میں ہمتِ مردانہ ہے
شمعِ کشتہ پر بھی جلتا ہے یہ وہ پروانہ ہے

عورت کا یہی پُر احترام تصور تھا جس نے احسان سے اپنی والدہ ماجدہ کی وفات پر "گورستان" لکھوائی۔ یہ نظم بڑی طویل اور پُر کیف ہے[۱۴]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اُردو کا جواں سال اور جواں ہمت شاعر احسانؔ دانش موت کے خارجی اثرات کو یوں تو ہمیشہ محسوس کرتا رہا ہے، لیکن اقبالؔ کی طرح اس کی بھی محبوب والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی قلبی واردات ایک دردناک نظم کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں"۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی اسی نظم کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"ڈاکٹر اقبالؔ مرحوم نے تو جگہ جگہ موت کو "تجدیدِ زندگی" سے تعبیر کیا ہے۔ اب مذاہب سے قطع نظر کر کے فلاسفہ و حکماء کی آراء اور ان کے نظریات کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ یونان کے بڑے بڑے فلاسفہ کے نزدیک موت کی حقیقت وہی رہتی تھی جس کو چکبست لکھنوی نے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشاں ہونا!

احسانؔ کے نزدیک موت نام ہے ایک کیفیت سے انتقال کا دوسری کیفیت کی طرف۔ اس بنا پر ہر ایک کیفیت دوسری کیفیت کے لحاظ سے موت اور پھر وہی کیفیت ایک اور کیفیت کے اعتبار سے زندگی ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

موت ہے "شانہ" ادائے زلفِ پُرخم کے لیے
موت ہے "فردوس بن جانا" جہنم کے لیے
شمعِ محفل کے لیے ہے موت "دامانِ نسیم"
روحِ گُل کو موت کا پیغام "پروازِ شمیم"
غم کی دلوی کے لیے "نورِ تبسم" موت ہے
خامشی کے واسطے "سازِ تکلم" موت ہے
مہر کی پہلی کرن" ہے صبح کے تارے کی موت
"ابر کا ہلکا سا چھینٹا" سرخ انگارے کی موت
دن کے حق میں "شام کی رنگیں شفق" پیغامِ موت
اور شفق کو "شب کے تاروں کا طبق" پیغامِ موت
"مسکراہٹ کا تجمل گریہ ہائے غم کی موت
سبزہ زاروں میں "سحر کی روشنی" شبنم کی موت

موت ہی جب تیرگی ہے۔ موت ہی تابندگی
زندگی ہے نام کس شے کا۔ کہاں ہے زندگی؟[۱۵]

آخر میں اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اور احسان کی نظم "گورستان" کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ شخصی مرثیے اردو شاعری میں شاہکار ہیں۔ اس تقابلی جائزے سے آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ اقبال اور احسان میں کتنی یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور احسان، اقبال سے کس قدر متاثر ہیں ؎

تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات	دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات	اقبال
گُل ہوئی شمعِ سکوں، سوزِ تمنا بجھ گیا	راہِ غربت میں چراغِ دین و دنیا بجھ گیا	احسان
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ	صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ	اقبال
جب بلاتا ہے تجھے فیضان، رو دیتا ہوں میں	دیکھتے ہی دیکھتے اوسان کھو دیتا ہوں میں	احسان
کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت	گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت	اقبال
شمعِ محفل کیلئے ہے موت "دامانِ نسیم"	رُوحِ گُل کو موت کا پیغام "پروازِ شمیم"	احسان
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت	دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت	اقبال
دُھوپ میں "سایہ" چمن میں "وحشت کے آثار" موت	حق میں موسیقار کے "تخلیقِ موسیقار" موت	احسان
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات	عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات	اقبال
گرچہ دن کے وقت تارے رونما ہوتے نہیں	روشنی میں ڈوب جاتے ہیں، فنا ہوتے نہیں	احسان
موت ذرّے کو بھی مرکز سے ہلا سکتی نہیں	شکل و صورت کو بدلتی ہے، مٹا سکتی نہیں	احسان
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے	خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے	اقبال
موت کے پردے سے کم ہوتی نہیں تابندگی	اس طرف بھی زندگی ہے، اُس طرف بھی زندگی	احسان
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے	خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے	اقبال
دل کا خون انسان کو آنکھوں سے بہانا چاہیے	روتے روتے آنسوؤں میں ڈوب جانا چاہیے	احسان
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں	آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں	اقبال
رُوح تو پھر رُوح ہے، آواز تک مرتی نہیں	عالمِ امکاں سے آگے سفر کرتی نہیں [۱۹]	احسان

حواشی

۱۔ جہانِ دانش، مؤلفہ احسان دانش، لاہور، دانش آباد، ۱۹۷۳ء، صفحہ ۴۰۲۔

۲۔ جہانِ دانش صفحہ ۴۰۰ تا ۴۰۲۔

Iqbal Cyber Library All rights reserved ©2002-2006

۳- نفیرِ فطرت، مؤلفہ احسان دانش۔ لاہور، مکتبہ دانش، ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۳۹۔
۴- ایضاً۔ صفحہ ۲۳۹ تا ۲۴۰۔
۵- 'صحیفہ' اقبال نمبر، حصہ اول اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۵۷ و ۵۸
مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی تصنیف "مفکرِ پاکستان" صفحہ ۴۲۷ تا ۴۲۹
۶- 'احسان دانش قطعے کے آئینے میں، از ڈاکٹر انور سدید صفحہ ۱۳۹۔
۷- ایضاً۔ صفحہ ۱۳۰
۸- رُدپ بہروپ، از آغا شورش کاشمیری، صفحہ ۱۷۸۔
۹- مقدمہ (سرباب) محمد توقیر طاہر گنگوہی، 'مقامات'، مؤلفہ احسان دانش، لاہور، مکتبہ دانش، سن ندارد، صفحہ ۱۵ و ۱۶
۱۰- 'عوامی شاعر اور اس کا فن، از پروفیسر سجاد حارث صفحہ ۱۵۲، ۱۶۱، ۱۶۲۔
۱۱- ایضاً صفحہ ۲۸۲
۱۲- ایضاً صفحہ ۱۶۸ و ۱۶۹
۱۳- کلیاتِ اقبال اُردو، صفحہ ۴۶، ۴۷۔
۱۴- احسان دانش: شاعرِ فطرت کے روپ میں، از وحید الحسن، 'جامِ نو' احسان نمبر جلد ۲۴ نمبر ۱۱/۱۲ صفحہ ۲۳ تا ۶۶
۱۵- 'اقبال کی شاعری' از عبدالمالک آردی صفحہ ۱۲۱ تا ۱۳۴
۱۶- 'بانگِ درا، صفحہ ۲۲۹ تا ۲۳۴ و 'گورستان' صفحہ ۸۸ تا ۹۹۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006